افسانچے

سید اسماعیل گوہر

تلاش

وہ خوشی اور سکون کی تلاش میں برسوں بھٹکتا رہا۔ زمین کا کونہ کونہ اس نے چھان مارا۔ لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیے مگر اسے نہ خوشی حاصل ہوئی اور نہ ہی سکون میسر آیا۔

پھر ایک دن اسے اچانک بچپن کے کچھ ساتھی مل گئے اور وہ ایک دم سے خوش ہوگیا۔

خواہش

ہر مہینے جب بھی اسے تنخواہ ملتی، وہ بچوں کی فرمائش کے مطابق ہر چیز لا کر دیتا۔ کبھی خود کے لیے کوئی چیز نہیں خریدتا۔ ایک دن اس کی بیٹی نے پوچھ ہی لیا، 'ابو! آپ ہم سب کی فرمائش پوری کرتے ہیں لیکن اپنے لیے کچھ نہیں لاتے ...کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؟'

اس نے بیٹی کو گود میں بٹھایا۔ اس کے رخساروں پر تھپکی دی اور اپنے آنسوؤں کو اندر ہی اندر جذب کرتے ہوئے کہا، 'ایسی بات نہیں ہے، بیٹا! جب میں چھوٹا تھا نا... بالکل تمہاری عمر کا...تو میرے ابو نے میری ہر خواہش پوری کردی تھی۔'

کاروبار

گاندھی میدان میں لگنے والے اردو کتاب میلے نے اس بار تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق میلے میں لگنے والی دکانوں نے دس لاکھ کا کاروبار کیا تھا۔ منتظمین اور شہر کی اردو تنظیمیں بہت خوش ہو رہی تھیں لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کہ دس میں سے نو لاکھ روپے کھانے پینے کی دکانوں سے حاصل ہوئے تھے۔

حقیقت

بچپن میں اکثر ایسا ہوتا تھا۔ امی، ابو کو چڑھانے کے لیے مجھ سے پوچھتیں، 'راجا بیٹا کس کا ہے؟'

تو میں فوراً جواب دیتا، 'امی کا۔'

اور ابو مسکرا کر رہ جاتے۔

لیکن آج جب میں ملک کے سب سے مشکل ترین امتحان یو پی ایس سی میں کامیاب ہوا۔ اور مقامی نیوز چینل کا رپورٹر مجھ سے انٹرویو میں پوچھ رہا تھا کہ...

'آپ کی کامیابی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟' تو بے اختیار میری زبان سے نکلا، 'میرے ابو کا!'

کاش

جب پہلی بار کسی استاد سے مار پڑی تو میں پنجم جماعت میں زیرِ تعلیم تھا۔ پانچ الفاظ اور ان کے معنی یاد نہ کرنے پر انگریزی کے استاد نے میری دونوں ہتھیلیوں پر چھڑی ماری تھی۔

میں بہت دیر تک روتا رہا۔ اس کے بعد پھر کبھی بھی میں نے انگریزی کے استاد سے مار نہیں کھائی۔

دھیرے دھیرے میری انگریزی جماعت میں سب سے اچھی ہوگئی۔

اب سوچتا ہوں، کاش!... مجھے ریاضی اور سائنس کے اساتذہ نے بھی مارا ہوتا۔ ■

s/o Sayyad Ibrahim
Behind Police Station, Nandura,
Distt.:Buldhana-443404

شاہکار

آخری قسط

رشید پروینؔ سوپور

اس بار میری حیرت کی کوئی انتہا ہی نہ رہی جب والد صاحب نے نہ تو کوئی ڈنڈا اٹھایا اور نہ ہی لاتوں سے میری آؤ بھگت کی بلکہ عجیب سے لہجے میں کہا، 'اب تمھیں پڑھنے کا خیال ترک کرکے محنت مزدوری کے لیے تیار ہونا چاہیے، کیونکہ میں اکیلے گھر کا بوجھ نہیں اٹھا پاتا۔' اور یہ درست بات بھی تھی۔ ہم تین بھائی اور ہماری تین بہنیں ہیں اور ان میں میں ہی بڑا ہوں، اس لیے یہ بوجھ اصولی طور پر مجھے ہی اٹھانا ہوگا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ میرے گھر کو اچھا خاصا ریلیف مل رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیٹے کہیں باہر ایم بی بی ایس کر رہے تھے اور ان کی صاحبزادی مس ذائقہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہی تھیں۔ میرے پاس ان کے گھر میں تین بجے تک کا وقت اکثر فرصت کا وقت ہوا کرتا تھا۔ شام کو بھی اکثر فرصت کے لمحات نصیب ہوتے اور اس دوران میں مطالعہ کرتا اور نئی نئی کہانیاں بھی لکھتا تھا۔

وقت بڑی تیزی سے گزرتا رہا۔ میں چاہتے ہوئے بھی کسی ایک لمحے کو مقید نہیں کر پایا۔ کون کر پاتا ہے؟

وقت بہتا رہا۔ میم صاحب کی پی ایچ ڈی ہوئی، یونیورسٹی میں پروفیسر بھی ہوئیں، ڈاکٹر صاحب کے دو بیٹے ڈاکٹر ہوئے، ایک نے ایم ڈی بھی کیا، میرے علم و فہم میں اضافہ ہوتا رہا اور مجھے خود ہی احساس تھا کہ اب میرے افسانوں میں کافی گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے لیکن یہ میرا ہی خیال تھا، ادب پرکھنے والوں اور صحافیوں کا خیال کچھ اور تھا جو اس واقعے سے ظاہر ہے۔ ایک بار مجھے شہر جانے کا اتفاق ہوا اور ہمت کر کے ایک بڑے اخبار کے دفتر پہنچا۔ انتظار کیا اور آخر ایڈیٹر صاحب کا دیدار ہوا۔ مجھے سر تا پا کئی لمحے گھورتے رہے، 'ہاں تو؟' انہوں نے اپنا چشمہ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا، 'کیا کام ہے؟'

میرا گلہ سوکھ رہا تھا۔ سامنے پانی کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر پانی پینا چاہتا تھا لیکن نہیں بیٹھ سکا، کیونکہ ایڈیٹر صاحب نے بیٹھنے کو کہا ہی نہیں۔

'جناب، میں افسانے لکھتا ہوں۔' میں نے جیب سے لفافہ نکالا، 'میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے ایک بار پڑھ لیں اور اگر آپ کے معیار پر اترے تو چھاپ دیں...اس سے میری حوصلہ افزائی ہوگی۔'

'تمہاری کوالیفکیشن؟' ایڈیٹر نے مسکرا کر پوچھا۔

چند لمحے تک میں کچھ نہیں کہہ پایا۔ آخر ہونٹوں سے دھیرے سے پھسلا، 'م، میٹرک...' اس سے پہلے کہ میں فیل کہتا، ایڈیٹر نے ایک قہقہہ لگایا، 'اس کلاس میں اور اس عمر میں بچے گائے اور گھوڑے پر مضامین لکھتے ہیں... اٹھو! میرا وقت ضائع مت کرو۔'

اس طرح دوسری بار بھی میں ایک رسالے کے ایڈیٹر سے ملا۔ یہ صاحب ایک ماہوار ادبی رسالہ نکالا کرتے تھے۔ جب میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ میں میٹرک فیل ہوں تو وہ بے ساختہ ہنستے ہنستے کرسی پر دہرے ہوگئے تھے اور بڑی مشکل سے ہنسی کے بیچ کہا تھا، 'کیا تم ٹیگور ہو؟...چلو، مان لیا کہ تم اچھے افسانے لکھتے ہو اور جب میں اسے چھاپوں گا تو تمہارے نام کے ساتھ کیا لکھوں...میٹرک فیل؟ یہاں بڑے نام ہی برانڈ بنتے ہیں اور تم نہ پروفیسر ہو، نہ شعبۂ اردو کے صدر ہو، نہ لیکچرار ہو، نہ ایم فل ہو، نہ پی ایچ ڈی ہو، نہ اکادمی کے سکریٹری ہو تو اس افسانے کو پڑھے گا کون اور میرے رسالے کو خریدے گا کون؟'

اس دن کے بعد میں سمجھ گیا کہ افسانے لکھنا ہی کافی نہیں بلکہ لکھنے والے کی کوئی اور پہچان بھی ضروری ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ اپنے تمام کاغذات اور کاپیاں کسی ردی والے کو بیچ دوں یا جلا دوں۔

میں اپنی ڈیوٹی کے بعد حسبِ معمول ڈاکٹر صاحب کے گھر آیا۔ ڈنر کے بعد ہی میری چھٹی ہوا کرتی تھی۔ کبھی آؤٹ ہاؤس ہی میں رات گزارتا اور کبھی گھر چلا جاتا لیکن آج میں نے فیصلہ کیا تھا کہ یہیں رہوں گا اور اپنے سارے کاغذات اور کاپیاں جلا کر ہمیشہ کے لیے لکھنے سے تائب ہو جاؤں گا۔ میں نے تمام کاغذات سمیٹ کر ایک چھوٹی سی تھیلی بنائی اور چپکے سے آؤٹ ہاؤس سے باہر آیا لیکن بدقسمتی سے ذائقہ صاحبہ نے مجھے اپنی کھڑکی سے شاید چوروں کی طرح تھیلی کے سمیت باہر آتے دیکھا تھا اور فوراً ہی باہر آ کر اس نے مجھے پکڑ لیا جب میں دروازے سے باہر جا رہا تھا، 'کیا ہے یہ؟...چوری بھی کرنے لگے ہو؟'

'ن، ن، نہیں تو...یہ تو میرے کاغذات اور کاپیاں ہیں...اور بس۔' میری آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

'مجھے دکھاؤ تو۔' ذائقہ نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ اسے کھنگالا کہ شاید کچھ نیچے چھپایا ہو لیکن کچھ نہیں ملا تو بولی، 'سچ بتاؤ...یہ کاپیاں اور کاغذات کیا ہیں اور کس کے ہیں؟'

'سچ اور کچھ نہیں۔' مجھے اپنی نوکری جاتی ہوئی لگی۔

'اچھا، تم اور افسانے!' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، 'میں پی ایچ ڈی ہوں، کوشش کے باوجود میں نہیں لکھ پائی کبھی...تو تم...اچھا، یہ تھیلا میں لے جا رہی ہوں...دیکھوں گی کہ کیا خرافات لکھتے ہو؟'

کئی دن بعد میں نے پروفیسر ذائقہ، ایم اے پی ایچ ڈی کا نام جلی حروف میں تمام بڑے بڑے اخبارات اور ادبی رسائل میں دیکھا۔

وقت آگے بڑھتا رہا۔

ذائقہ دیدی ملک کی بڑی افسانہ نگاروں میں شامل ہوگئیں۔ مجھ پر مہرباں ہوگئیں اور کبھی کبھی ہفتے دو ہفتے کے بعد سو پانچ سو موج منانے اور کھانے پینے کے لیے دیتی رہیں جس کے بدلے میں میں کوئی نئی کہانی ان کی خدمت میں حاضر کرتا رہا۔

ایک بار بڑے پیار سے پوچھا، 'تم میرے لیے لکھتے ہو...کبھی افسوس نہیں ہوتا...میں تمہاری محنت سے اتنا بڑا نام کما چکی ہوں۔'

'اس میں افسوس کی کیا بات ہے، میڈم... تاج محل استاد احمد عیسیٰ خان کے خوابوں میں ضرور رہا ہوگا لیکن اس سے جمنا کنارے دھرتی پر شاہجہاں ہی نے اتارا تھا۔' میں نے مسکرا کر کہا تھا۔

میرا قلم رک گیا۔ ذہن کو جھٹکا سا لگا اور مجھے چائے کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے قلم کاپی ایسے ہی چھوڑ کر کینٹین کی راہ لی۔

آرام سے چائے پی، ذہن بالکل خالی سا تھا۔ نظر چنار کی طرف اٹھائی تو کسی اور شخص کو چنار کے سائے میں بیٹھے ہوئے پایا جس کے ہاتھ میں میری کاپی تھی۔ تیزی سے آگے بڑھا۔

'یہ تمہاری ہی کاپی ہے۔' اس نے نظر اٹھا کے پوچھا۔

'جی۔' چند لمحوں تک وہ مجھے ایک ٹک گھورتا رہا۔ مجھے لگا، اس کی دھندلی دھندلی آنکھیں میرے وجود کے اندر تک جھانک رہی ہیں۔

'بیٹھو...یہ تمہارا ''شاہکار'' ادھورا ہے...ابھی کلائمکس نہیں لکھا؟' اس کے چہرے کی سنجیدگی کچھ اور کہہ رہی تھی۔

'جی، سوجھا ہی نہیں۔' میں نے جواب دیا۔

'یہ جو اندر فنکشن ہو رہا ہے، اس میں سات ڈاکٹرس ہیں جن کے لیے تھیسس میں نے لکھی تھیں... ہاہاہا۔' اس نے قہقہہ لگایا، 'کوئی یقین نہیں کرے گا لیکن تم یقین کرو گے...میں اس یونیورسٹی کا لائبریرین تھا۔ سروس کے ستائیس سال میں سات بار پی ایچ ڈی کے لیے تھیسس لکھی ہے اور آخری تھیسس تمہاری میم صاحب ہی کے لیے لکھی تھی۔' اس نے کہا اور سر کو اس طرح جھٹکا جیسے کوئی بوجھ سر سے اتار دیا ہو۔

وہ چلا گیا۔

میں نے 'شاہکار' کا کلائمکس لکھا۔ گاڑی کا دروازہ کھولا، کیونکہ پروفیسر ذائقہ، ایم اے پی ایچ ڈی، انعام یافتہ ہو کر پریس ہجوم میں گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں جن کے ڈیش میں نیا افسانہ 'شاہکار' ان کا منتظر تھا۔ ■

امام بخش ناسخؔ

مقبول شاعر
مشہور غزل

یاد آتی ہیں ہمیں جان تمہاری باتیں
ہائے وہ پیار کی آواز وہ پیاری باتیں
پہروں چپ رہتے ہیں ہم اور اگر بولتے ہیں
وہی پھر پھر کے الٹتی ہیں تمہاری باتیں
غیر ہر دم مجھے باتیں جو سنا جاتے ہیں
جانتا ہوں یہ میں اے جان تمہاری باتیں
یاد آتا ہے ترا کیا کے عوض کا کہنا
ہائے پھر کب میں سنوں گا وہ گنواری باتیں
ہے بری بات یہ اغیار سے باتیں کرنی
ورنہ اے جان تری اچھی ہیں ساری باتیں
اس طرح بول نکلتے نہ سنے تھے ہم نے
کرتی ہے صاف صنم تیری ستاری باتیں
تو وہ اعجاز بیاں ہے کہ مسیحا سمجھیں
سن لیں اے جان کسی دن جو جواری باتیں
اس لیے اشک بہاتا ہوں دم فکر سخن
کہ ہمیشہ رہیں دنیا میں یہ جاری باتیں
تو وہ گل ہے کہ اگر کان دھرے گلشن میں
ہو زباں موج کرے باد بہاری باتیں
کیجیے سحر بیانی سے مسخر کیوں کر
کبھی سنتا نہیں ناسخؔ وہ ہماری باتیں

میرے دل میں کوئی ملال نہیں
ہے وہ آئینہ جس میں بال نہیں
نارسا فکر کا مآل نہیں
شاعری محض اک خیال نہیں
دیدہ دل نے اس کو دیکھ لیا
میری آنکھوں کا کمال نہیں
حسن کے اس کی کیا کروں تعریف
کوئی شے پر تو جمال نہیں
چاندنی تھی قمرؔ کے ساتھ کبھی
اب تو کوئی شریک حال نہیں

قمرؔ سیتاپوری

Purani Bans Mandi, Khadra, Sitapur
Road, Lucknow-226020

زندگانی ہوگئی بے کار ہے
لگ رہا ہے موت ہی درکار ہے
ترچھی نظروں سے ہمیں مت دیکھئے
ہر نشانہ دل کے اپنے پار ہے
یوں نہ تڑپاؤ ہمیں جان وفا
جینا اور مرنا یہاں دشوار ہے
ہم تمہارے تم ہمارے ہوں گے کب
جب بھی پوچھو آپ سے انکار ہے
خود کا میں تحسینؔ دشمن بن گیا
کوئی بھی میرا نہیں اغیار ہے

تحسین رضا قادری رفاعی کانپوری

میرے آگے وہ اپنی شرم سے پلکیں جھکاتی تھی
ہمارے گاؤں میں جب بھی کوئی بارات آتی تھی
میں کس سے مل کے آیا ہوں یہ ماں پہچان جاتی تھی
کہ اس کے جسم کی خوشبو میرے کپڑوں سے آتی تھی
اسے اپنی ہتھیلی پر نہ ہونے دیتی تھی دھندلا
وہ میرے نام کے اوپر بہت مہندی لگاتی تھی
کبھی ریشم کا تکیہ رات میں اس کو نہیں بھایا
میرے بازو کے تکیے پر ہی اس کو نیند آتی تھی
میں اس کو چھیڑتا رہتا تھا اکثر اس لئے کیونکہ
وہ بے حد پیاری لگتی تھی اسے جب شرم آتی تھی

ارون شرما صاحب آبادی

F-73, First Floor, Patel Nagar-3,
Ghaziabad-201003